رسائل و مسائل

اسلامی ریاست کے امکانات اور اس میں ذمی رعایا کی حیثیت

ترجمان القرآن کے گذشتہ نمبر کے "رسائل و مسائل" میں اس مسئلے کے متعلق ایک ہندو دوست کا مراسلہ مع جواب درج ہو چکا ہے۔ اب انہی صاحب کے مزید دو خطوط (غیر متعلق امور کے حذف کے بعد) مع جواب درج کیے جاتے ہیں:۔

سوال: آپ کی چند تصانیف و عنایت نامہ پڑھنے کے بعد میں یہ فیصلہ کرنے میں حق بجانب ہوں کہ آپ خالص اسلامی طرز کی حکومت قائم کرنے کے خواہاں ہیں اور اس اسلامی حکومت کے عہد میں ذمی اور اہل کتاب کی حیثیت بالکل ایسی ہی ہوگی جیسی ہندوؤں میں اچھوتوں کی۔

آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ "ہندوؤں کی عبادت گاہیں محفوظ رہیں گی، ان کو مذہبی تعلیم کا انتظام کرنے کا حق دیا جائے گا"۔ مگر آپ نے یہ نہیں تحریر فرمایا کہ آیا ہندوؤں کو تبلیغ کا حق بھی حاصل ہوگا یا نہیں؟ آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ "جو بھی اس حکومت کے اصول کو تسلیم کرے وہ اس کے چلانے میں حصہ دار ہو سکتا ہے، خواہ وہ ہندو زادہ ہو یا سکھ زادہ"۔ براہ کرم اس کی توضیح کیجیے کہ ایک ہندو ہندو رہتے ہوئے بھی کیا آپ کی حکومت کے اصولوں پر ایمان لا کر اسے چلانے میں شریک ہو سکتا ہے؟

پھر آپ نے فرمایا ہے کہ اہل کتاب کی عورتوں سے مسلمان نکاح کر سکتے ہیں مگر آپ نے ساتھ ہی یہ واضح نہیں کیا کہ آیا اہل کتاب بھی مسلم عورتوں سے نکاح کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر جواب نفی میں ہے تو کیا آپ اس احساس برتری (Superiority complex) کے بارے میں مزید روشنی ڈالیں گے؟ اگر آپ اس کے اثبات (Justification) کے لیے اسلام پر ایمان کی اوٹ لیں تو کیا آپ یہ ماننے کے لیے تیار ہیں کہ موجودہ نام نہاد مسلمان آپ کے قول کے مطابق ان اسلامی قواعد اور کیرکٹر کے اصولوں پر پورے اتریں گے؟ آج کے مسلمان کی بات تو الگ رہی، کیا آپ یہ تسلیم نہیں کریں گے کہ خلافت راشدہ کے عہد میں اکثر و بیشتر جو لوگ اسلام لائے وہ زیادہ تر سیاسی اقتدار کے خواہاں تھے؟ اگر آپ یہ تسلیم کرنے سے قاصر ہیں تو فرمائیے کہ پھر وہ اسلامی حکومت کیوں صرف تیس پینتیس سال چل کر رہ گئی؟ پھر کیوں حضرت علیؓ جیسے مدبر اور مجاہد کی اس قدر شدید مخالفت ہوئی اور مخالفین میں حضرت عائشہ صاحبہ تک تھیں؟

آپ حکومت الٰہیہ کے خواہاں ہوتے ہوئے پاکستان کی مخالفت کرتے ہیں۔ کیا آپ اپنی حکومت الٰہیہ ملکی حدود کے بغیر ہی نافذ کر سکیں گے؟ یقیناً نہیں! تو پھر آپ کی حکومت الٰہیہ کے لیے ملکی حدود بہرحال وہی موزوں ہو سکتی ہیں جہاں مسٹر جناح اور ان کے حواری پاکستان کے لیے جد و جہد کر رہے ہیں۔ آپ پاکستان کی حدود کے علاوہ کیوں سارے ہندوستان میں حکومت الٰہیہ نافذ کریں گے؟ نیز یہ گرہ بھی کھولیے کہ آپ موجودہ ماحول میں اس طرز حکومت کو چلانے کے لیے ایسے بلند اخلاق اور بہترین کیرکٹر کی شخصیتیں کہاں سے پیدا کریں گے؟ جبکہ حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر، حضرت عثمان غنی جیسے عدیم المثال بزرگ اسے چند سالوں سے زیادہ نہ چلا سکے۔ چودہ سو سال کے بعد ایسے کون سے موافق حالات آپ کے پیش نظر ہیں جن کی بنا پر آپ کی دور رس نگاہیں حکومت الٰہیہ کو عملی صورت میں دیکھ رہی ہیں؟ اس میں شک نہیں کہ آپ کا پیغام ہر خیال کے مسلمانوں میں زور و شور سے پھیل رہا ہے اور مجھے جس قدر بھی مسلمانوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے وہ سب اس خیال کے حامی ہیں کہ آپ نے جو کچھ کیا ہے وہ عین اسلام ہے، مگر ہر شخص کا اعتراض یہی ہے جو میں نے گذشتہ سطور میں پیش کیا ہے، یعنی آپ کے پاس عہد خلافت

راشدہ کی اصولی حکومت چلانے کے لیے فی زمانہ کیرکٹر کے آدمی کہاں ہیں؟ پھر جبکہ وہ بہترین نمونہ کی ہستیاں اس نظام کو نصف صدی تک بھی کامیابی سے نہ چلا سکیں تو اس دور میں اس طرز کی حکومت کا خیال خوش فہمی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟

علاوہ بریں ایک چیز اور بھی عرض کرنا چاہتا ہوں۔ کچھ مدت پہلے میرا یہ خیال تھا کہ صرف ہم ہندوؤں میں ہی ایک مشترک نصب العین نہیں ہے۔ بخلاف اس کے مسلمانوں میں اجتماعی زندگی ہے اور ان کے سامنے واحد نصب العین ہے۔ لیکن اب اسلامی سیاست کا بغور مطالعہ کرنے پر معلوم ہوا کہ وہاں کا حال ہم سے بھی دگرگوں ہے۔ آپ سے چھپاؤں گا نہیں، میں نے تقریباً مختلف مراکز فکر کے مسلم رہنماؤں سے ان کے نصب العین اور طریقۂ کار کے بارے میں ایک متلاشئ حق کی حیثیت سے چند ایک امور جو میرے لیے تحقیق طلب تھے دریافت کیے۔ ان کے جوابات موصول ہونے پر میرا پہلا خیال غلط نکلا اور معلوم ہوا کہ مسلمانوں میں بھی طریقۂ کار اور نصب العین کے بارے میں زبردست اختلاف پایا جاتا ہے۔

(اس موقع پر جناب مستفسر نے جماعت اسلامی سے اختلاف رکھنے والے بعض اصحاب کی تحریروں سے چند سطور نقل کی ہیں۔ انھیں حذف کیا جاتا ہے)

ملاحظہ فرمایا آپ نے، آپ کے مشترکہ العقیدہ رہنما کس شدید اختلاف آرا میں مبتلا ہیں۔ ان ٹھوس حقائق اور واقعات کو نظرانداز کر کے محض کتابوں کے صفحات پر ایک چیز کو نظریہ کی شکل میں پیش کر دینا اور بات ہے اور اسے عملی جامہ پہنانا قطعاً مختلف چیز ہے۔ سیاست ایک ٹھوس حقیقت ہے جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ کیا آپ میرے اس سارے التماس کو سامنے رکھ کر اپنے طریقۂ کار اور راہ عمل سے بہ تفصیل مطلع فرمائیں گے؟

جواب: آپ کے سوالات کا سرا حقیقت میں ابھی تک میں نہیں پا سکا ہوں، اس وجہ سے جو جوابات میں دیتا ہوں ان میں سے کچھ اور ایسے سوالات نکل آتے ہیں جن کے نکلنے کی مجھے توقع نہیں ہوتی۔ اگر آپ پہلے بنیادی امور سے بات شروع کریں اور پھر بتدریج فروعی معاملات اور وقتی سیاسیات (Current Politics) کی طرف آئیں تو چاہے آپ مجھ سے متفق نہ ہوں لیکن کم از کم مجھے اچھی طرح سمجھ ضرور لیں گے۔ سر دست تو میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ میری پوزیشن آپ کے سامنے پوری طرح واضح نہیں ہے۔

آپ نے اپنے عنایت نامہ میں تحریر فرمایا ہے کہ "جس اسلامی حکومت کا میں خواب دیکھ رہا ہوں اس میں ذمی اور اہل کتاب کی حیثیت وہی ہوگی جو ہندوؤں میں اچھوتوں کی ہے"۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ یا تو آپ ذمیوں کی حیثیت میرے صاف صاف بیان کر دینے کے باوجود نہیں سمجھے ہیں یا ہندوؤں میں اچھوتوں کی حیثیت سے واقف نہیں ہیں۔ اول تو اچھوتوں کی جو حیثیت منو کے دھرم شاستر سے معلوم ہوتی ہے اس کو ان حقوق و مراعات سے کوئی نسبت نہیں ہے جو اسلامی فقہ میں ذمیوں کو دیے گئے ہیں۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اچھوت پن کی بنیاد نسلی امتیاز پر ہے اور ذمیت کی بنیاد محض عقیدہ پر۔ اگر ایک ذمی اسلام قبول کر لے تو وہ ہمارا امیر و امام تک بن سکتا ہے۔ مگر کیا ایک شودر کسی عقیدہ و مسلک کو قبول کر لینے کے بعد ورن آشرم کی پابندیوں سے بری ہو سکتا ہے؟

آپ کا یہ سوال کہ "آیا ہندوؤں کو اسلامی ریاست میں تبلیغ کا حق بھی حاصل ہوگا یا نہیں"، جتنا مختصر ہے اس کا جواب اتنا مختصر نہیں ہے۔ تبلیغ کی کئی شکلیں ہیں۔ ایک شکل یہ ہے کہ کوئی مذہبی گروہ خود اپنی آئندہ نسلوں کو اور اپنے عوام کو اپنے مذہب کی تعلیم دے۔ اس کا حق تمام ذمی گروہوں کو حاصل ہوگا۔ دوسری شکل یہ ہے کہ کوئی مذہبی گروہ تحریر یا تقریر کے ذریعہ سے اپنے مذہب کو دوسروں کے سامنے پیش کرے اور اسلام سمیت دوسرے مسلکوں سے اپنے وجوہ اختلاف کو علمی حیثیت سے بیان کرے۔ اس کی اجازت بھی ذمیوں کو ہوگی، مگر ہم کسی مسلمان کو اسلامی ریاست میں رہتے ہوئے اپنا دین تبدیل کرنے کی اجازت نہ دیں گے۔ تیسری شکل یہ ہے کہ کوئی گروہ اپنے مذہب کی بنیاد پر ایک منظم تحریک ایسی اٹھائے جس کی غرض یا جس کا مآل یہ ہو کہ ملک کا نظام زندگی تبدیل ہو کر اسلامی اصولوں کے بجائے اس کے اصولوں پر قائم ہو جائے۔ ایسی تبلیغ کی اجازت ہم اپنے حدود اقتدار میں کسی کو نہیں دیں گے۔ اس مسئلے پر میرا مفصل مضمون "اسلام میں قتل مرتد کا حکم" ملاحظہ فرمائیے۔

اہل کتاب کی عورتوں سے مسلمان کا نکاح جائز اور مسلمان عورتوں سے اہل کتاب کا نکاح ناجائز ہونے کی بنیاد کسی احساس برتری پر نہیں ہے، بلکہ یہ ایک نفسیاتی حقیقت پر مبنی ہے۔ مرد بالعموم متاثر کم ہوتا ہے اور اثر زیادہ ڈالتا ہے۔ عورت بالعموم متاثر زیادہ ہوتی ہے اور اثر کم ڈالتی ہے۔ ایک غیر مسلمہ اگر کسی مسلمان کے نکاح میں آئے تو اس کا امکان کم ہے کہ وہ اس مسلمان کو غیر مسلم بنالے گی اور اس بات کا امکان زیادہ ہے کہ وہ مسلمان ہو جائے گی۔ لیکن ایک مسلمان عورت اگر کسی غیر مسلم کے نکاح میں چلی جائے تو اس کے غیر مسلمہ ہو جانے کا بہت زیادہ اندیشہ ہے اور اس بات کی توقع بہت کم ہے کہ وہ اپنے شوہر کو اور اپنی اولاد کو مسلمان بنا سکے گی۔ اسی لیے مسلمانوں کو اس کی اجازت نہیں دی گئی ہے کہ وہ اپنی لڑکیوں کا نکاح غیر مسلموں سے کریں۔ البتہ اگر اہل کتاب میں سے کوئی شخص اپنی بیٹی مسلمان کو دینے پر راضی ہو تو مسلمان اس سے نکاح کر سکتا ہے۔ لیکن قرآن میں جہاں اس چیز کی اجازت دی گئی ہے وہاں ساتھ ہی ساتھ یہ دھمکی بھی دے دی گئی ہے کہ اگر غیر مسلم بیوی کی محبت میں مبتلا ہو کر تم نے ایمان کھو دیا تو تمھارا سب کیا کرایا برباد ہو جائے گا اور آخرت میں تم خسارے میں رہو گے۔ نیز یہ اجازت ایسی ہے جس سے خاص ضرورتوں کے مواقع پر ہی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ یہ کوئی پسندیدہ فعل نہیں ہے جسے قبول عام حاصل ہو بلکہ بعض حالات میں تو اسے روکا بھی گیا ہے تاکہ مسلمانوں کی سوسائٹی میں غیر مسلم عناصر کے داخل ہونے سے کسی نامناسب اخلاقی اور اعتقادی حالت کا نشو و نما نہ ہو سکے۔

آپ کا یہ سوال کہ اسلامی حکومت صرف تیس پینتیس سال چل کر کیوں رہ گئی ایک اہم تاریخی مسئلہ سے متعلق ہے۔ اگر آپ اسلامی تاریخ کا بغور مطالعہ کریں تو اس کے اسباب سمجھنا آپ کے لیے کچھ زیادہ مشکل نہ ہوگا۔ کسی خاص اصول کی علمبردار جماعت جو نظام زندگی قائم کرتی ہے اس کا اپنی پوری شان کے ساتھ چلنا اور قائم رہنا اس بات پر منحصر ہوتا ہے کہ لیڈر شپ ایک ایسے چیدہ گروہ کے ہاتھ میں رہے جو اس اصول کا سچا اور سرگرم پیرو ہو۔ اور لیڈر شپ ایسے گروہ کے ہاتھ میں صرف اسی حالت میں رہ سکتی ہے جبکہ عام باشندوں پر اس گروہ کی گرفت قائم رہے اور ان کی عظیم اکثریت کم از کم اس حد تک تعلیم و تربیت پائی ہوئی ہو کہ اسے اس خاص اصول کے ساتھ گہری وابستگی بھی ہو اور وہ ان لوگوں کی بات سننے کے لیے تیار بھی نہ ہو جو اس اصول سے ہٹ کر کسی دوسرے طریقہ کی طرف بلانے والے ہوں۔ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینے کے بعد اسلامی تاریخ پر نظر ڈالیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو تمدنی انقلاب رونما ہوا اور جو نیا نظام زندگی قائم ہوا اس کی بنیاد یہ تھی کہ عرب کی آبادی میں ایک طرح کا اخلاقی انقلاب (Moral revolution) واقع ہو چکا تھا اور آنحضرت کی قیادت میں صالح انسانوں کا جو مختصر گروہ تیار ہوا تھا اس کی قیادت تمام اہل عرب نے تسلیم کر لی تھی۔ لیکن آگے چل کر عہد خلافت راشدہ میں جب ملک پر ملک فتح ہونے شروع ہوئے تو اسلام کی مملکت میں توسیع بہت تیزی کے ساتھ ہونے لگی اور استحکام اتنی تیزی کے ساتھ نہ ہو سکا۔ چونکہ اس زمانہ میں نشر و اشاعت اور تعلیم و تبلیغ کے ذرائع اتنے نہ تھے جتنے آج ہیں اور نہ وسائل حمل و نقل موجودہ زمانہ کے مانند تھے، اس لیے جو فوج در فوج انسان اس نئی مسلم سوسائٹی میں داخل ہونے شروع ہوئے ان کو اخلاقی، ذہنی اور عملی حیثیت سے اسلامی تحریک میں مکمل طور پر جذب کرنے کا انتظام نہ ہو سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی عام آبادی میں صحیح قسم کے مسلمانوں کا تناسب بہت کم رہ گیا اور خام قسم کے مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی۔ لیکن اصولاً ان مسلمانوں کے حقوق اور اختیارات اور سوسائٹی میں ان کی حیثیت صحیح قسم کے مسلمانوں کی بہ نسبت کچھ بھی مختلف نہ ہو سکتی تھی۔ اسی وجہ سے جب حضرت علیؓ کے زمانہ میں جوابی انقلاب کی تحریکیں Counter-revolutionary movements رونما ہوئیں تو مسلمان پبلک کا ایک بہت بڑا حصہ ان سے متاثر ہو گیا اور لیڈر شپ ان لوگوں کے ہاتھ سے نکل گئی جو ٹھیٹھ اسلامی طرز پر کام کرنے والے تھے۔

اس تاریخی حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد ہمیں یہ واقعہ ذرہ برابر بھی دل شکستہ نہیں کرتا کہ خالص اسلامی حکومت تیس پنتیس سال سے زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی۔

آج اگر ہم ایک صالح گروہ اس ذہنیت، اس اخلاق اور اس سیرت کے انسانوں کا منظم کر سکیں جو اسلام کے منشار کے مطابق ہو تو ہم امید رکھتے ہیں کہ موجودہ زمانہ کے ذرائع و وسائل سے فائدہ اٹھا کر نہ صرف اپنے ملک بلکہ دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی ہم ایک اخلاقی و تمدنی انقلاب برپا کر سکیں گے اور ہمیں پورا یقین ہے کہ ایسے گروہ کے منظم ہو جانے کے بعد عام انسانوں کی قیادت اس گروہ کے سوا کسی دوسری پارٹی کے ہاتھ میں نہیں جا سکتی۔ آپ مسلمانوں کی موجودہ حالت کو دیکھ کر جو رائے قائم کر رہے ہیں وہ اس حالت پر چسپاں نہیں ہو سکتی جو ہمارے پیش نظر ہے۔

اگر صحیح اخلاق کے حامل انسان میدان عمل میں آجائیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مسلمان عوام ہی نہیں بلکہ ہندو، عیسائی، پارسی اور سکھ سب ان کے گرویدہ ہو جائیں گے اور خود اپنے ہم مذہب لیڈروں کو چھوڑ کر ان پر اعتماد کرنے لگیں گے۔ ایسے ہی ایک گروہ کو تربیت اور تعلیم اور تنظیم کے ذریعہ سے تیار کرنا اس وقت میرے پیش نظر ہے اور میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ اس کام میں وہ میری مدد کرے۔

حکومت الٰہیہ اور پاکستان کے فرق کے متعلق جو سوال آپ نے کیا ہے اس کا جواب آپ میری کتابوں میں پا سکتے تھے مگر وہ شاید آپ کی نظر سے نہیں گذریں۔ پاکستان کی بنیاد قومیت کے اصول پر ہے، یعنی مسلمان قوم کے افراد جہاں اکثریت میں ہوں وہاں انھیں اپنی حکومت قائم کرنے کا حق حاصل ہو۔ بخلاف اس کے حکومت الٰہیہ کی بنیاد اسلام کا اصول ہے۔ پاکستان صرف ان لوگوں کو اپیل کر سکتا ہے جو صرف مسلمان قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن حکومت الٰہیہ کی دعوت تمام انسانوں کو اپیل کر سکتی ہے، خواہ وہ پیدائشی مسلمان ہوں یا پیدائشی ہندو یا کوئی اور۔ پاکستان صرف وہیں قائم ہو سکتا ہے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، اور اس بات کی بہت کم توقع ہے کہ پاکستان کی حکومت خالص اسلامی حکومت ہوگی، کیونکہ خالص اسلامی حکومت کا قیام جس اخلاقی انقلاب پر منحصر ہے وہ پاکستان کی تحریک سے رونما نہیں ہو سکتا۔ لیکن حکومت الٰہیہ اس کی محتاج نہیں ہے کہ کسی جگہ مسلمان قوم کی اکثریت پہلے سے موجود ہو۔ وہ تو ایک اخلاقی اور ذہنی اور تمدنی انقلاب کی دعوت ہے اور سارے انسانوں کے لیے خود انہی کی فلاح کے چند اصول پیش کرتی ہے، اس دعوت کو اگر پنجاب یا سندھ سب سے پہلے آگے بڑھ کر قبول کر لیں تو حکومت الٰہیہ یہاں قائم ہو سکتی ہے اور اگر مدراس یا بمبئی یا کوئی دوسرا علاقہ پیش قدمی کر کے اسے قبول کرے تو حکومت الٰہیہ وہاں قائم ہو سکتی ہے۔ ہم اس دعوت کو مسلمان، ہندو، سکھ، عیسائی، ہر ایک کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ مسلمانوں کی کوئی قومی جائداد نہیں ہے، بلکہ تمام انسانوں کی فلاح کے چند اصول ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ پیدائشی مسلمان اس دعوت کو قبول کرنے میں کوتاہی دکھائیں اور پیدائشی ہندو آگے بڑھ کر اسے قبول کر لیں۔

آپ کا یہ سوال بالکل عجیب ہے کہ کیا ایک شخص ہندو ہوتے ہوئے ان اصولوں پر ایمان لے آئے تو آپ اسے برابر کا حصہ دار بنا سکیں گے؟ ظاہر ہے کہ جو شخص ہمارے ان اصولوں پر ایمان لے آئے گا وہ ہندو کب رہے گا، وہ تو مسلمان ہو جائے گا۔ ان اصولوں پر ایمان لے آنا ہی تو مسلمان ہو جانا ہے۔ اور جو مسلمان ہو گیا وہ یقیناً ہمارے ساتھ برابر کا شریک ہے۔

آپ کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ مسلمانوں میں ایک مشترک مقصد اور نصب العین کا فقدان ہندوؤں سے بھی کچھ زیادہ پایا جاتا ہے۔ درحقیقت یہ سب کچھ نتیجہ ہے اسلام سے بے نیاز ہو کر دنیوی معاملات کو خواہشات نفس اور غیر مسلم طور طریقوں کی تقلید سے حل کرنے کی کوشش کا۔

اگر مسلمان خالص اسلامی اصول پر اپنے انفرادی و اجتماعی مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرتے تو آپ ان کو ایک ہی مقصد اور ایک ہی نصب العین کے پیچھے اپنی ساری قوتیں صرف کرتے ہوئے پاتے۔ آپ نے مسلمانوں کے اندر خیالات اور اعمال کا جو انتشار محسوس کیا ہے اسے میں بھی ایک مدت سے دیکھ رہا ہوں اور ہماری اسلامی تحریک کے ساتھ مسلمانوں کے مختلف طبقوں کا جو رویہ ہے وہ بھی میری نگاہ میں ہے، مگر ان چیزوں سے میرے اندر کوئی بددلی پیدا نہیں ہوتی، کیونکہ ان باتوں کی تہ میں جو اصل خرابی ہے اسے میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ صرف یہی نہیں کہ میں بددل نہیں ہوں بلکہ ایک بڑی حد تک پر امید ہوں۔ جیسا کہ آپ نے خود بھی تحریر فرمایا ہے، مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ بڑی تیزی کے ساتھ اس بات کو تسلیم کرتا جاتا ہے کہ جو چیز میں پیش کر رہا ہوں یہی اصلی اور خالص اسلام ہے۔ اس کے ساتھ میں یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ مسلمانوں کے موجودہ مختلف گروہ جس طرز پر کام کر رہے ہیں اس سے ان کا کامیابی کی منزل تک پہنچنا تقریباً محال ہے۔ لہٰذا اس امر کا قوی امکان ہے کہ مستقبل قریب میں مسلمان نوجوان ان مختلف گروہوں سے اور ان کی سیاست سے مایوس ہو جائیں گے اور ان کے لیے خالص اسلام کے اصول پر کام کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہے گا۔ صرف یہی نہیں بلکہ میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ ہندوؤں میں بھی جب قوم پرستی، سیاسی آزادی کی منزل پر پہنچ جائے گی تو انھیں سیاست اور معاشرت اور تمدن کی مشینری کو چلانے کے لیے کچھ اصول درکار ہوں گے اور وہ گاندھی جی کے فلسفے یا ہندو مہاسبھا کی نری قوم پرستی میں نہ مل سکیں گے۔ اس وقت ان کے لیے صرف دو ہی راستے ہوں گے، یا تو اشتراکیت کے اصولوں کو اختیار کریں یا پھر اسلام کے اصولوں کو قبول کر لیں۔ اس موقع کے پیش آنے تک اگر ہم اصول اسلام کے لیے لاگ داعیوں کا ایک صالح گروہ منظم کرنے میں کامیاب ہو گئے تو مجھے ۸۰ فیصدی امید ہے کہ ہم اپنے ہندو اور سکھ بھائیوں کو اشتراکیت سے بچانے اور اسلام کے اصولوں کی طرف کھینچ لانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

ہمارے اس مقصد کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان موجودہ قومی کشمکش ہے۔ مگر ہم امید کرتے ہیں کہ جس طریقہ پر ہم اس وقت کام کر رہے ہیں اس سے ہم ہندوؤں اور سکھوں اور دوسری غیر مسلم قوموں کے اس تعصب کو جو وہ موجودہ مسلمانوں کی غلط روش کی وجہ سے اسلام کے خلاف رکھتے ہیں بالآخر دور کر دیں گے اور انھیں اس بات پر آمادہ کر لیں گے کہ وہ اسلام کو خالص اصولی حیثیت سے دیکھیں، نہ کہ اس قوم کے مذہب کی حیثیت سے جس کے ساتھ دنیوی اغراض کے لیے ان کی تو تو میں میں سے کشمکش برپا ہے۔

اسلامی نظام حکومت میں فرقوں کی حیثیت

سوال:۔ حکومت الٰہیہ میں شیعوں کی کیا حیثیت ہوگی؟

جواب:۔ اس مسئلہ میں اتنی پیچیدگیاں ہیں کہ ابھی تک میں خود اپنے ذہن میں بھی اسے پوری طرح نہیں سلجھا سکا ہوں۔ مشکل پر مزید مشکل یہ ہے کہ تاریخ کے جس دور کو ہم اپنے لیے شمع ہدایت سمجھتے ہیں وہاں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی اور نہ کتاب و سنت میں کوئی اصولی ہدایت ایسی ملتی ہے جس سے بآسانی ہم اس مسئلہ کو سلجھا سکیں۔ دور نبوت میں تو ظاہر ہے کہ سب مسلمان ایک ہی گروہ تھے اور اصول کیا معنی، فروع میں بھی ان کے درمیان اختلافات نہ تھے۔ اس کے بعد دور خلافت آیا اور اس میں بھی بیشتر فروعی اختلافات تھے۔ اصولی اختلافات رکھنے والے فرقوں کا وجود نہ تھا۔ حضرت علیؓ کے زمانہ میں بلاشبہہ خوارج کا ظہور ہوا جنھوں نے